اسلام میں دولت وافلاس کا توازن

(از جناب مولوی سید زاہد قیصر صاحب رضوی فاضل دیوبند)

وراثت اسلام میں" وراثت" سے پہلے عام طور پر" وصیت" کا رواج تھا" وصیت" کی تعریف یہ ہے کہ متوفی کسی اجنبی شخص کے لئے اپنے ورثا کو ہدایت کرے کہ اس کی دولت . . . . بتمامہ یا اس کا کوئی مخصوص حصہ اس کو دیدیا جائے! ہر چند کہ اس قسم کی ہدایات کا منشا بہترین جذبہ ہوتا تھا۔جس سے حق دوستی ادا کرنا یا کسی احسان کی مکافات کرنا مقصود ہوتا تھا لیکن سوسائٹی نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جس کی بدولت حقوق محفوظ نہ رہ سکے، بسا اوقات متوفی اپنے اعزہ واقربا سے ناراض ہوکر پوری دولت کی وصیت ایک اجنبی شخص کے لئے کردیتا تھا جس سے مستحقین محروم ہوجاتے تھے۔شریعت نے اس ظلم وفساد کے پیش نظر" وراثت" کا قانون جاری کیا اور حسب حیثیت ہر شخص کے حقوق اس میں محفوظ کردیئے گئے اور فی الجملہ" وصیت" کا طریقہ بند کردیا گیا۔چنانچہ حدیث میں ہے:-

عن ابی امامۃ الباھلی قال سمعت	ابوامامہ باہلی سے منقول ہے کہ میں نے" حجۃ الوداع"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول	کے خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ
فی خطبۃ عام حجۃ الوداع ان اللہ	آپ فرماتے تھے کہ خدا نے وراثت کے حقداروں
تبارک وتعالیٰ قد اعطیٰ کل ذی حق	کو ان کا حق دیدیا ہے، اب کسی شخص کے لئے
حقہ فلا وصیۃ لوارث (ترمذی)	" وصیت" کرنا جائز نہیں ہے۔

لیکن بسا اوقات متوفی کسی ایسے شخص کا رہین احسان ہوتا ہے جو اس کا وارث نہیں ہو ایسے خاص حالات میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وصیت کی اجازت دیدی ہے لیکن اس کے لئے ایک خاص مقدار مقرر کردی ہے اور پوری دولت میں سے تہائی حصہ سے زیادہ کی وصیت کرنا ممنوع قرار دیا ہے

جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

عن سعد بن وقاص قال مرضت عام الفتح مرضاً اشفیت منہ علی الموت، فاتانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعودنی فقلت یا رسول اللہ ان لی مالاً کثیراً ولیس یرثنی الا ابنتی افاوصی بمالی کلہ قال لا فثلثی مالی قال لا قلت الشطر قال لا قلت فالثلث قال الثلث والثلث کثیر انك ان تذر ورثتك اغنیاء خیراً من ان تذرهم عالة یتکففون الناس (ترمذی۔ موطا امام مالک)	سعد بن وقاص ؓ سے منقول ہے کہ فتح مکہ والے سال میں ایسا بیمار ہوا کہ مرنے کے قریب ہو گیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لئے تشریف لائے میں نے عرض کیا کہ میرے پاس بہت زیادہ دولت ہے اور ایک لڑکی کے سوا میرا اور کوئی وارث نہیں ہے تو کیا میں اپنی پوری دولت کی وصیت نہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، تو میں نے دو ثلث مال کی وصیت کے لئے اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ یہ بھی جائز نہیں، میں نے نصف کے لئے عرض کیا، آپ نے اس کو بھی منع فرما دیا! بالآخر میں نے ایک تہائی کے لئے اجازت چاہی! تب آپ نے فرمایا کہ اچھا کر دو اگرچہ ثلث بھی زیادہ ہے۔ تم اپنے ورثار کو مستغنی چھوڑ جاؤ یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو محتاج چھوڑا جائے اور وہ تمہارے بعد بھیک مانگنے پر مجبور ہوں!

اس حدیث میں شارع علیہ السلام نے وصیت کے باب میں غلو کرنے سے منع فرمایا ہے اور وراثت کو حتی الامکان رائج کرنا چاہا ہے اور ساتھ ہی حکیمانہ اسلوب پر اس کی علت بھی بتلا دی ہے اور اس کا جو بھیانک منظر دکھلایا ہے انسان کی خودی اس کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ وفات کے بعد اولاد اس درجہ مفلس ہو جائے کہ وہ دریوزہ گری کے لئے مجبور ہو اس لرزہ خیز تصور سے کوئی خوددار انسان وصیت کرنے میں غلو نہیں کر سکتا۔

اسلام سے پہلے وراثت کا ہمہ گیر تصور جو خاندان کے جملہ افراد پر حاوی و مستوعب ہو کسی ملک،

کسی قوم اور کسی زمانہ میں نہیں پایا جاتا۔ اقوام عالم میں وراثت کا سسٹم یا بالکل معدوم تھا یا حد درجہ ناقص، چنانچہ ہندوؤں میں لڑکیاں وراثت سے محروم رہتی ہیں اور متوفی کے پورے ترکہ کے وارث صرف لڑکے سمجھے جاتے ہیں، البتہ ریاست اور اسٹیٹ میں سے ان کو کسی قدر وظیفہ مل سکتا ہے متوفی کے باقی تمام اعزا محروم رہتے ہیں۔

بلاد عرب میں بھی وراثت کا تقریباً یہی قانون مروج تھا اور ان کے ہاں بھی لڑکیوں اور اقربا کو میت کے ترکہ سے کچھ نہیں ملتا تھا۔ خیر یہ تو ان قوموں کا حال ہے جن کو غیر متمدن کہا جاتا ہے لیکن آج یورپ جو اپنی تہذیب و تمدن میں پوری دنیا پر فوقیت کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنے کلچر کو تمام عالم انسانی کے لئے ایک مایۂ رحمت خیال کرتا ہے اس کے ہاں بھی وراثت کا قانون ہنوز تشنہ ہے اور مقدم الذکر اقوام سے بھی زیادہ ناقص ہے، چنانچہ یورپ میں صرف بڑا لڑکا متوفی کی پوری دولت کا مالک سمجھا جاتا ہے اور باقی لڑکے اور لڑکیاں وظیفہ کی حقدار سمجھی جاتی ہیں۔

لیکن ان سب کے برخلاف اسلام نے وراثت کا مکمل قانون پیش کیا ہے اور اس پر توجہ دلانے کے لئے اسلام کے دستور اساسی (قرآن) میں جا بجا اس کا ذکر کیا گیا ہے اور فرائض کے اصول و کلیات کو منقح کر دینے کے علاوہ بہت کچھ جزئیات بھی بیان کی گئی ہیں اور سورہ نساء تو گویا فرائض ہی کے باب میں نازل ہوئی ہے۔ مثلاً وللرجال نصیب مما ترك الوالدان والاقربون الایہ (ترجمہ) والدین اور اقربا جو کچھ بھی ترکہ چھوڑیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت! اس میں مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ حصص متعین ہیں" اور لکل جعلنا موالی مما ترك الوالدان والاقربون الآیہ (ترجمہ) والدین و اقربا جو کچھ بھی مال و دولت چھوڑیں ہم نے ان میں سے ہر ایک کے وارث مقرر کئے ہیں" ان کے علاوہ اس کی اکثر و بیشتر آیات میں فرائض ہی کا تذکرہ ملتا ہے اور بالخصوص سورۂ نساء کے دو رکوع (دوسرے رکوع اور سب سے آخر کے چوبیسویں رکوع) کا موضوع تو مستقل طور پر بالکلیہ وراثت ہی ہے۔ جن میں انتہائی تفصیل کے ساتھ "مسائل ارث" بیان کئے گئے ہیں، دوسرے رکوع کے اخیر میں خاتمہ کے طور پر جو جملے مذکور ہیں وہ قابل غور ہیں اور شریعت نے وراثت کے ساتھ جس قدر اعتنا کیا ہے

وہ اس کے بالکلیہ آئینہ دار ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

تلك حدود الله ومن يطع الله	مذکورہ بالا مسائل خدا کی حدود ہیں جس نے اللہ
ورسوله يدخله جنت تجری	اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ دائمی طور پر
من تحتها الانهار خلدين فيها	جنت میں داخل ہوگا جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں
ابدا وذالك الفوز العظيم ومن	اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جس نے اللہ اور اس کے
يعص الله ورسوله ويتعد حدوده	رسول کی نافرمانی کی اور اس کے قانون کو توڑا تو
يدخله نارا خالدا فيها وله عذاب مهين (نساء)	وہ جہنم کے دردناک عذاب میں ڈھکیل دیا جائیگا۔

اس کے ماسوا احکام فرائض کے امتثال و تاکید کے لئے وہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو قرآن میں بہت کم مسائل کے لئے برتے جاتے ہیں اور بہت زیادہ اہم فرائض کے لئے مستعمل ہوتے ہیں چنانچہ کہیں ان مسائل کو "وصیۃ من اللہ اور "نصیبا مفروضا" بتلا کر واجب التعمیل قرار دیا ہے اور کبھی "فریضۃ من اللہ" کے فرمان سے امتثال کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن کے بعد حدیث میں بھی اس باب میں بہت تاکیدی احکامات بیان کئے گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غایت اہمیت کے ساتھ اس کا حکم فرماتے ہیں۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله	ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
صلی الله عليه وسلم تعلموا الفرائض	نے فرمایا کہ قرآن و فرائض خود سیکھو اور لوگوں کو
والقران وعلموا الناس فانی مقبوض	سکھلاؤ کیونکہ میں عنقریب وفات پانے والا ہوں

(ترمذی۔ مسند دارمی)

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں قرآن سیکھنے کا حکم فرمایا ہے وہیں فرائض کو بھی فراموش نہیں فرمایا، اس خصوصیت سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور پھر ترغیب کا اسلوب جس درجہ موثر و دلکش ہے وہ صرف نبوت ہی کا حصہ ہے، انہی نصوص شرعیہ کا اثر ہے کہ مسلمانوں نے وراثت پر اپنی بہترین دماغی کاوشیں صرف کیں اور اس کی تمام جزئیات و کلیات کو منقح اور واضح کر دیا۔ اور اس پر اس قدر توجہ کی کہ وراثت کے اصول و فروع سے متعلق ایک مستقل فن بن گیا

جو فرائض کے نام سے موسوم ہے۔

اسلام نے وراثت کے اجرا میں مندرجہ ذیل امور ملحوظ رکھے ہیں، جن لوگوں میں یہ تینوں امور موجود ہوں یا ان میں سے کوئی ایک پایا جائے تو وہ اسی حیثیت سے علی قدر درجات وراثت کے مستحق سمجھے جائیں گے :۔

۱۔ وہ افراد جن میں میت کے جانشین ہونے کی صلاحیت ہو!

۲۔ وہ افراد جن میں متوفی کی خیر خواہی اور شفقت غایت درجہ پائی جاتی ہو!

۳۔ وہ افراد جو ان ہر دو صفات کے مالک ہوں!

یہ وہ اصول ہیں جن کی بنیاد پر ایک سنگین عمارت قائم کی جا سکتی ہے کیونکہ اصولاً متوفی کے ترکہ کے حقدار وہ افراد ہونے چاہئیں جن کو متوفی سے تعلق ہو پھر ان میں بھی جن افراد کا جتنا زیادہ قریبی تعلق ہوگا ان کو وراثت میں اسی قدر مقدم رکھا جائے گا یعنی وراثت میں سب سے زیادہ حصہ کے وہی لوگ مستحق ہوں گے اور پھر یہ تعلق جس درجہ کم ہوتا جائے گا اسی قدر وراثت سے تمتع بھی کم کر سکے گا۔ اسی بنا پر وراثت میں نمبر ۳ کے افراد سب سے مقدم سمجھے جاتے ہیں کیونکہ متوفی سے سب سے زیادہ تعلق انہی کو ہوتا ہے۔ اسلام نے نہایت دقت و باریک بینی کے ساتھ انسانی تعلقات میں درجات قائم کئے ہیں اور اسی تعلق کی کمی بیشی کا لحاظ کر کے علی الدرجات کم و بیش حصص مقرر کئے ہیں۔ یہ اسلام کی صداقت کی نہایت تابناک دلیل ہے کہ اس نے جن دقیق و نازک فروق کی بنا پر حصص مقرر کئے ہیں فطرت انسانی ان میں ابتک کچھ تغیر نہیں کر سکی!

متذکرہ صدر اصول کی بنا پر اسلام میں وراثت جاری کی جاتی ہے، مثلاً اگر متوفی کے نرینہ اولاد موجود ہے تو پورا ترکہ اس کی اولاد اور بیوی میں منقسم ہو جائے گا کیونکہ میت کا سب سے زیادہ قریبی تعلق انہی لوگوں سے ہے، اولاد میں سے صرف لڑکوں کو وراثت کا مستحق قرار دینا یا ان میں سے بڑے لڑکے کو حقدار سمجھنا سخت ترین ناانصافی ہے کیونکہ تمام اولاد کو باپ سے مساوی تعلق ہوتا ہے۔

یہاں یہ بتلادینا ضروری ہے کہ وراثت کے قانون اور اس کی کلیات وجزئیات میں ایک عالمگیر قانون کی طرح یہ چیز ملحوظ رکھی گئی ہے کہ فطرتِ انسانی کا جو عام دستور ہے اور جس طرز پر انسانی تعلقات ازل سے قدرتی طور پر قائم ہوتے چلے آرہے ہیں اسی کے مطابق احکام نافذ کئے جائیں ورنہ ایسی نظائرِ دنیا سے معدوم نہیں ہیں جن کے عالمِ وجود میں آنے سے فطرت کے عام دستور پر اثر نہ پڑا ہو۔ اخلاف فطرت واقعات سے تاریخ کا دامن خالی نہیں ہے! لیکن ایک ہمہ گیر قانون بناتے وقت ایسی شاذ و نادر الوقوع امثال سے صرفِ نظر کے ماسوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

یہ علم فرائض کے چند بنیادی اصول ہیں جن کی اتنی تفصیل کردی گئی ہے جس کی ایک مجلاتی مقالہ میں گنجائش ہوسکتی ہے، جزئیات و تفصیلات معلوم کرنے کے لئے "علم الفرائض" کی مبسوط کتب کی طرف رجوع کرنا چاہئے!!!

وظائف | وظائف سے ہماری مراد مسلسل معینہ وقت پر معین نقدی سے امداد کرنا ہے، عام طور پر اقوام و ممالک میں وظیفہ کبھی کسی حق الخدمت کے طور پر دیا جاتا ہے اور کبھی محض امداد کے طور پر! اول الذکر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کو "وظیفہ" دیا جائے وہ حصولِ معاش کی الجھنوں سے یکسر مطمئن ہوکر فراغ خاطر کے ساتھ خاطر خواہ ملک و قوم اور علم کی خدمات انجام دے سکے لیکن موخر الذکر کا مقصد اس کے برخلاف ہے، اس کا مقصد محض مالی امداد دینا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے محنت و کوشش اور جدوجہد کے بغیر راحت و آرام اور آسائش سے زندگی بسر کی جاسکے۔ اسلام میں موخر الذکر وظائف کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ ملک و قوم اور علم کی ترقی کی سعی اور ان کی خدمت کرنا چاہتے ہوں، ان کے لئے اسلامی قانون وظائف میں خصوصی رعائتیں ہیں تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھاکر خاطر خواہ کامیابی حاصل کرسکیں۔

اسلام نے وظائف کو جنگی نظام میں بھی بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس میں ہر سپاہی کی حسبِ احتیاج وظیفہ مقرر کیا جاتا ہے اسلام ایک سپاہی کو محض پندرہ روپیہ میں نہیں خریدتا بلکہ اس کے

بیوی، بچوں کو بھی "وظیفہ" دیا جاتا ہے۔ بچوں کا وظیفہ پیدائش کے وقت سے مقرر کیا جاتا ہے۔

یہاں اس امر کی تصریح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بعض مورخین کی رائے ہے کہ اسلام میں وظائف کا سسٹم صرف فوجی نظام سے متعلق ہے اس کے برخلاف دوسرے مورخین یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ پبلک ورکس کا ایک شعبہ ہے، ہر فریق تائید و تردید میں اپنے اپنے دلائل بیان کرتا ہے! اس کا فیصلہ دلائل کی صورت میں تو یقیناً دشوار ہے لیکن علما اور ماہرین فن کے وظائف سے معلوم ہوتا ہے کہ وظائف صرف اہل فوج ہی کے لئے مخصوص نہ تھے بلکہ ایسے لوگوں کو بھی وظائف کا مستحق سمجھا جاتا تھا جو علم، ملک و قوم اور تہذیب و تمدن کی خدمت اور ترقی کے لئے اپنے اوقات کو بالکلیہ وقف کر دیتے تھے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ اگر وظائف کا سسٹم صرف فوجی نظام ہی سے متعلق ہو تو اس سے پبلک کی علمی اور اقتصادی حالت درست ہوئی یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً ہے تو وظائف اگرچہ فوجی نظم ہی کے لئے کیوں نہ ہوں لیکن پبلک ورکس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس سسٹم کے رواج پذیر ہونے سے حالات میں جو تغیر ہوگا اور حیرت انگیز ترقی کے برقی اثرات جس سرعت سے نمودار ہوں گے۔ موجودہ حالات میں ان کا اندازہ یورپ کے ان ممالک سے کیا جا سکتا ہے۔ جہاں پوری قوم کو فوجی نظام میں منسلک کر دیا گیا ہے، ان ممالک کا ہر ہر فرد ایک مستقل سپاہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ حکومت اس سے بروقت ضرورت فوجی خدمات لے سکتی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ان ممالک میں قبل از خدمات کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا اور اسلامی نظام میں ایسے لوگ بھی جن کو موجودہ اصطلاح میں "والنٹیر" کہنا چاہیے "وظائف پانے کے حقدار متصور ہوں گے۔

ایسے ممالک میں جہاں وظائف کا سسٹم جاری کیا جاتا ہے عام رعایا فوج کا کام دیتی ہے جن میں کچھ باقاعدہ سپاہی ہوتے ہیں اور فوجی نظم کے تحت اپنی خدمات دائمی طور پر حکومت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر جنگی مہمات میں مصروف رہتے ہیں، باقی لوگ اپنے اپنے گھروں پر رہتے ہیں اور آرام و آسائش سے زندگی بسر کرتے ہیں لیکن بروقت ضرورت حکومت کے لئے

فوج کا کام دیتے ہیں گویا ان کی حیثیت والنٹیر جیسی ہوتی ہے لیکن آجکل حکومتوں میں والنٹیر تنخواہ کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔

غرضیکہ وظائف کے سسٹم میں حکومت کی جنگی ضروریات میں رعایا کا اکثر و بیشتر حصہ جو فوجی خدمات ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے سپاہی بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے بعض افراد کی وہ مخفی قوتیں جو افلاس اور معیشت کی کشمکش میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ظہور پذیر نہیں ہو سکتیں اور سوسائٹی ان کے گرانمایہ فوائد سے اکثر و بیشتر محروم رہتی ہے ظہور میں آنے لگتی ہیں جن کی مفکرانہ ذہنی قابلیتیں قوموں کی تقدیریں بدل دیتی ہیں اور سب سے بڑی خوبی اس نظام میں یہ ہے کہ دولت و افلاس کے مابین وہ طبقاتی کشمکش تخلیق نہیں پا سکتی جو آج عالمگیر مصیبت بن کر دنیا پر چھا گئی ہے۔ اور جس کے حل کرنے سے مفکرین کے دماغ اور مدبرین سلطنت عاجز آ چکے ہیں۔

اسلام میں وظائف کا سسٹم فاروق اعظمؓ کی اولیات میں سے ہے۔ آپ نے ہر شہر کی مردم شماری کرائی اور عام رعایا کے مع ان کی بیوی بچوں اور غلاموں کے وظائف مقرر کئے اور تمام ملک میں اس نظام کو جاری کر دیا گیا اور ہر جگہ سالانہ وظائف تقسیم ہونے لگے چنانچہ عہد فاروقی میں خاص مدینہ منورہ میں تین کروڑ درہم کے وظائف تقسیم ہوتے تھے (تاریخ یعقوبی) اسی قسم کے نظام کا اثر ہے کہ فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں عربوں نے جس حیرت زا انداز پر ترقی اور فتوحات حاصل کیں اس کی نظیر ماقبل و مابعد میں معدوم ہے، فاروق اعظم کے عہد خلافت میں جس کی کل مدت ۱۰ سال ۶ ماہ ۴ دن ہے۔ عربوں نے اس زمانہ کی دو سب سے بڑی شہنشاہیتوں "رومن ایمپائر" اور ایران کی شہنشاہیت کو فتح کر لیا تھا اور ۲۲۵۱۰۳ میل مربعہ علاقہ پر ان کی حکومت قائم ہو گئی تھی!!!!

اوقاف | اوقاف کی تعریف یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کو جو نفع رساں ہو عام افراد کے لئے مخصوص کر دیا جائے تاکہ عوام الناس اس سے بلا تکلف و احسان انتفاع کر سکیں، جیسے معابد، کنوئیں، باغات اور دوسری آمدنی رکھنے والی جائدادیں ہیں جن سے بلا واسطہ یا بالواسطہ انتفاع کیا جا سکتا ہے۔

"اوقاف" خالصۃً اسلام کی اولیات میں سے ہیں، اسلام سے پہلے اوقاف کا تصور کسی سرمایہ دار

کے تنگ ذہن میں نہ آسکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بہت کچھ تحریص کی ہے اور نئے نئے اسلوب سے اس پر توجہ اور ترغیب دلائی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ* انسان کی موت کے ساتھ ساتھ اس کے تمام اعمال ختم ہوجاتے ہیں اور اس کے نامۂ اعمال میں کسی مزید ثواب کی گنجائش باقی نہیں رہتی لیکن تین اعمال ایسے ہیں کہ موت کے بعد بھی ان کا ثواب بدستور قائم رہتا ہے۔ اُن میں سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوقاف کو بتلایا ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا مات الانسان انقطع عنہ عملہ الا من ثلاث: صدقۃ جاریۃ وعلم ینتفع بہ وولد صالح یدعو لہ (ترمذی، مسلم)۔

ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے اعمال کا ثواب منقطع ہوجاتا ہے مگر تین اعمال کا! اوقاف، علم نافع اور اولاد صالح جو اس کے لئے دعا کرتی رہے۔

اسلام میں سب سے پہلا وقف فاروقِ اعظمؓ نے کیا جو خیبر کی زمین میں کیا گیا تھا، ذیل کی حدیث میں وقفِ فاروقی کا مفصل واقعہ مذکور ہے:۔

عن ابن عمر ان عمر تصدق بمال لہ علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان یقال لہ ثمغ وکان نخلا فقال عمر یا رسول اللہ انی استفدت مالا وھو عندی نفیس فاردت ان اتصدق بہ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم تصدق باصلہ لا یباع ولا یوھب ولا یورث ولکن ینفق ثمرہ فصدقۃ

ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں فاروق اعظمؓ نے اپنے کھجوروں کے باغ کو جس کا نام ثمغ تھا وقف کیا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے خیبر میں ایک نہایت عمدہ باغ ملا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اس کو خدا کی راہ میں وقف کردوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نفس مال کو وقف کردو تاکہ اس میں ہبہ، فروخت نہ کیا جاسکے اور نہ اس میں وراثت جاری کی جائے

ذلك فی سبیل اللہ	بلکہ لوگ اس کے پھل سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ
وفی الرقاب والمساکین	حضرت عمرؓ نے انہی شرائط کے ساتھ اس کو وقف
والضیف وابن السبیل	کر دیا۔ وقف کا مصرف امور خیر، غلاموں کو آزاد
ولذی القربیٰ۔	کرانا، مساکین، مہمان، مسافر اور اعزہ واقربا کی
(بخاری۔ مسلم۔ ترمذی)	حاجت روائی میں صرف کرنا تھا۔ (ملخصاً)

اگر اوقاف کا نگراں (متولی) اپنی حاجت روائی کے لئے اس میں سے معمولی طور پر استعمال کرے تو کوئی حرج نہیں ہے وہ اپنے دوستوں کو بھی کھلا سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ اوقاف کے ذریعہ سے دولتمند بننا نہ چاہتا ہو، چنانچہ حدیث میں ہے:۔

ولاجناح علی من ولیہ ان یاکل	متولی اوقاف کی آمدنی میں سے اپنے گذر اوقات کے لئے
منھا بالمعروف اویوکل صدیقا	لے سکتا ہے اور اپنے دوستوں کو بھی دے سکتا ہے مگر شرط یہ ہے
غیر متمول بہ (بخاری)	کہ اس سے وقف کو کوئی نقصان نہ پہنچے (ملخصاً)۔

مذکورہ بالا احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "وقف فاروقی" کے متعلق جو شرائط متعین فرمائی ہیں اور اس حدیث سے اوقاف کا جو مصرف معلوم ہوتا ہے اسلام میں جملہ اوقاف میں یہی شرائط برتی گئی ہیں۔

۱۔ اوقاف کو ہبہ نہیں کیا جا سکتا!

۲۔ اوقاف کو فروخت نہیں کیا جا سکتا!

۳۔ اوقاف میں وراثت کا اجرا نہیں ہو سکتا۔

اوقاف کا مصرف حسب التفصیل یہ ہے:۔

۱۔ امورِ خیر میں صرف کرنا۔

۲۔ غلاموں کو آزاد کرانا۔

۳۔ مساکین کی خبر گیری کرنا

۴ــــ مہمان نوازی کرنا۔

۵ــــ مسافروں کے قیام اور راحت و آرام کا اہتمام کرنا۔

۶ــــ اعزہ و اقربا اور دیگر غربا کی حاجت روائی کرنا۔

۷ــــ ان لوگوں کی ضروریات میں صرف کرنا جن کے پاس بقدر احتیاج دولت مہیا کر سکنے کے ذرائع موجود نہیں ہیں۔

اسلام میں اوقاف کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ اوقاف خیری اور اوقاف اہلی۔

"اوقاف خیری" کے منافع سے پبلک کا ہر فرد بقدر استحقاق مستفید ہو سکتا ہے اس کے لئے وہی شرائط ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف فاروقی کے لئے متعین فرمائی ہیں، فاروق اعظمؓ کا وقف "اوقاف خیری" میں شمار ہوتا ہے۔

"اوقاف اہلی" کے لئے شرائط تو وہی ہیں لیکن اس کے مصرف میں نسبتاً زیادہ تعمیم نہیں ہوتی بلکہ اس کا منافع واقف کی اولاد و احفاد اور اعزہ و اقربا کے لئے مخصوص ہوتا ہے، عہد نبوی میں اوقاف اہلی کی مثال حضرت ابوطلحۃ انصاریؓ کا وقف ہے جس کی تفصیل ذیل کی حدیث میں بیان کی گئی ہے۔

انہ سمع انس بن مالك يقول	حضرت انس بن مالکؓ سے منقول ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ
كان ابو طلحة اكثر انصاري بالمدينة	انصار مدینہ میں سب سے بڑے زمیندار تھے اور
مالا من نخل وكان احب ماله	ابوطلحہؓ کو اپنی زمینوں میں سب سے زیادہ پسند
اليه بيرحا مستقبلة المسجد وكان	بیرحا نامی ایک باغ تھا جو مسجد نبوی کے سامنے واقع تھا
رسول الله صلى الله عليه وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اکثر تشریف لیجاتے اور
يدخلها ويشرب من ماء فيها طيب	اس کے کنویں کا شیریں پانی پیتے، جب آیت لن تنالوا البر
قال انس فلما نزلت "لن تنالوا البر حتى	تنفقوا مما تحبون" (جب تک تم اپنی پسندیدہ اشیاء
تنفقوا مما تحبون" قام ابو طلحة	کو خدا کی راہ میں صرف نہیں کرو گے تم ثواب نہیں پا سکتے)
فقال يا رسول الله ان الله يقول	نازل ہوئی تو ابوطلحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

"لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون" و	عرض کیا کہ خدا کا حکم ہے "لن تنالوا البر" الایہ اور مجھے
ان احب اموالی الی بیرحا وانها	اپنی جائداد میں سب سے زیادہ پسند "بیرحا" ہے۔
صدقۃ للہ ارجو برها وذخرها عند اللہ	آج سے بیرحا خدا کی راہ میں وقف ہے میں اس سے
فضعها حیث اراک اللہ	ثواب اور رضائے الٰہی کی توقع رکھتا ہوں آپ اس کو
فقال بخ ذالک مال رابح	حسب مرضی خیرات کر دیجئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
وقد سمعت ما قلت وانی	نے فرمایا مبارک! یہ باغ تمہیں بہت زیادہ نفع دے گا
اری ان تجعلها فی الاقربین قال	اگر تم اس کو خیرات کرنا چاہتے ہو تو اپنے اعزہ و اقربا کے لئے
ابو طلحۃ افعل یا رسول اللہ	اس کو وقف کردو! ابو طلحہؓ نے عرض کیا جیسا آپ فرمائیں
فقسمها ابو طلحۃ فی اقاربہ وبنی عمہ	چنانچہ ابو طلحہؓ نے حسب الحکم اس کو اپنے اعزہ و اقربا
(بخاری)	میں تقسیم کر دیا۔ (ملخصاً)

اوقاف کی ہر دو قسمیں خیرات و صدقات کی تمام مدوں میں سب سے زیادہ سود مند اور پائیدار ہیں۔ تمام صدقات جو غربا پر کئے جاتے ہیں ان کے صرف ہو جانے کے بعد غربا پھر دستِ نگر بن جاتے ہیں اور ان کو پھر مزید صدقات کی احتیاج ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کا دوام اور مقدار بھی غیر متعین ہوتی ہے لیکن اوقاف میں اس کے برخلاف اس کا حل مل جاتا ہے اور ایک مرتبہ جو وقف کر دیا جاتا ہے اس کے دوام کے علاوہ اس کی مقدار بھی معین ہوتی ہے اور نفع بھی مسلسل ہوتا ہے جو نسلاً بعد نسلٍ جاری رہتا ہے او یکے بعد دیگرے بہت سی نسلوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ثواب کو ممتد فرمایا ہے۔

غنائم اور فے | جنگ میں جو مال کفار سے ہاتھ لگتا ہے اس کو مال غنیمت کہتے ہیں اور اگر دشمن بغیر جنگ کئے ہوئے مرعوب ہو کر فرار ہو جائے تو اس صورت میں جو مال حاصل ہوتا ہے اس کو "مال فے" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غنائم اور فے کا استعمال اور تقسیم اسلام کی اولیات میں سے ہے۔ اسلام میں سب سے پہلے سریۂ عبداللہ بن جحشؓ کو مالِ غنیمت ملا، یہ جنگ ۲ سنہ ہجری میں غزوۂ بدر سے قبل ہوئی تھی۔

عہدِ نبوی میں تقسیم غنائم کا طریقہ یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال کو حکم فرماتے تھے کہ فوج میں منادی کردیں کہ جس شخص کو دشمن کا جو مال ملا ہو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا دے لوگ پورا مالِ غنیمت بارگاہِ نبوت میں جمع کردیتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پانچ حصے کرنے کے بعد تقسیم فرمادیتے تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص انہ	عمرو العاصؓ کے صاحبزادے عبداللہ بیان کرتے ہیں
قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اصاب	کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی مال غنیمت ملتا تو
غنیمۃ امر بلالاً فنادی فی الناس فیجیئون	حضرت بلالؓ کو حکم فرماتے کہ فوج میں منادی کردیں
بغنائمھم فیخمسہ ویقسمہ	لوگ اپنے اپنے غنائم لے آتے تھے آپ اس کو پانچ حصے
الحدیث (ابوداؤد)	کرکے تقسیم فرمادیتے تھے۔

غنائم کا مصرف یہ ہے کہ جو کچھ ہاتھ لگے وہ سب پبلک کی آسودگی کے لئے صرف کردیا جائے اسلام نے اس کے پانچ حصے مقرر کئے ہیں جن میں سے چار حصے (۴/۵) اہلِ فوج میں تقسیم کردیئے جاتے ہیں اور اصولِ تقسیم کے مطابق ہر ایک سپاہی کو حصہ ملتا ہے ایک حصہ بیت المال (سرکاری خزانہ)[1] میں داخل کردیا جاتا ہے جس کے مستحق حاجتمند لوگ ہوتے ہیں اور جو کچھ ان سے بچ رہتا ہے اس کو رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کردینے کا حکم دیا گیا ہے۔

مالِ فے میں اہلِ فوج کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ وہ تمامہ غرباء و فقراء میں تقسیم ہوتا ہے قرآن میں اس کا مصرف بالتفصیل بتلایا گیا ہے:۔

ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القریٰ	خدا نے جس مال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے

---

[1] بیت المال اور خزانۂ سرکاری میں ایک لطیف فرق ہے، سرکاری خزانہ بالعموم بادشاہوں کے قبضہ و اختیار میں ہوتا ہے وہ اس کو بلا تکلف خرچ کرنے کے مجاز ہوتے ہیں یا اس میں سے کوئی معین مقدار ان کو دی جاتی ہے جو نہایت گرانقدر ہوتی ہے جیسا کہ بالعموم آج کل ان ممالک میں رواج ہے جہاں "امپیریلزم" ابھی تک باقی ہے۔ اس کے برخلاف بیت المال سے مسلمانوں کا امیر صرف اس قدر رقم لینے کا مجاز ہوسکتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی معمولی ضروریات پوری کرسکے۔ (زاہد قیصر)

فللہ وللرسول ولذی القربی والیتمیٰ — "فئے" قرار دیا ہے اس کا مصرف اللہ ورسول، اقربا،
والمساکین وابن السبیل کی لا یکون — یتامیٰ، مساکین اور مسافر ہیں تاکہ دولت صرف
دولۃ بین الاغنیاء منکم (حشر آیت) — اغنیاء ہی کے مابین سمٹ کر نہ رہ جائے (ملخصاً)

قرآن نے مالِ فئے کو مختلف اصناف پر تقسیم کردینے کے حکم کی علت یہ بتلائی ہے کہ سرمایہ داروں کے پاس ضرورت سے زائد دولت جمع نہ ہوسکے بلکہ دولت تقسیم ہوتی رہی اور پھیلاؤ کی وجہ سے سوسائٹی کے ہر فرد کے پاس بقدر احتیاج پہنچ سکے۔

یہاں یہ بتلا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے علاوہ تقسیم غنائم وفے کا سسٹم دوسرے مذاہب واقوام میں قطعاً موجود نہیں ہے۔ مثال کے طور پر مغربی ممالک کو لے لیجئے جو تہذیب وتمدن اور عوام الناس کی خیر خواہی کے بڑے بڑے دعاوی کرتے ہیں، دورانِ جنگ میں دشمن کے بڑے بڑے ذخائر ان کے قبضے میں آجاتے ہیں مگر تمام یافتہ اشیا رحکومت کی ملک قرار دی جاتی ہیں جس میں نہ اہلِ فوج کا کچھ حصہ ہے اور نہ عام پبلک کے حاجتمندوں کو اس سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے حالانکہ یہ تمام ذخائر انہی کی بدولت حاصل ہوتے ہیں۔

صدقۃ الفطر رمضان میں حق تعالیٰ نے جو عظیم الشان فریضہ مسلمانوں پر واجب کیا ہے اس کے حسن اسلوبی سے ادائیگی کے تشکر میں صدقۃ الفطر واجب ہوتا ہے، صدقۃ الفطر نماز عید سے قبل ادا کیا جاتا ہے۔ اس کا حکیمانہ سبب یہ ہے کہ جو لوگ عید کی مسرتوں میں فقدانِ دولت کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکتے وہ بھی اس تقریب میں کسی نہ کسی حد تک شامل ہوجائیں چنانچہ حدیث میں ہے:۔

عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ — ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
علیہ وسلم کان یامر باخراج الزکوٰۃ — کا حکم ہے کہ عید کے دن "صدقۃ الفطر" نماز میں
قبل الغدو للصلوٰۃ یوم الفطر (ترمذی) — جانے سے قبل ادا کیا جائے۔ (ملخصاً)

اس حدیث سے صدقۃ الفطر کی تاکید کا تو پتہ چلتا ہے مگر اس کی مقدار معلوم نہیں ہوتی لیکن دوسری حدیث میں عجلت کی تاکید کے ساتھ ساتھ صدقۃ الفطر کی مقدار بھی بتلائی گئی ہے:۔

عن ابن عمر انہ قال فرض رسول اللہ ﷺ ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
علیہ وسلم زکوۃ الفطر صاعاً من تمر او صاعاً وسلم نے صدقۃ الفطر میں ہر مسلمان مرد و عورت
من شعیر علی العبد والحر والذکر والانثی آزاد و غلام اور بچہ اور بڑے پر ۳ ½ کھجور یا جو
والصغیر والکبیر من المسلمین وان تودی فرض کئے ہیں اور اس کی بھی تاکید کی ہے کہ
قبل خروج الناس الی المصلی (بخاری، مسلم)۔ عیدگاہ جانے سے قبل صدقۃ الفطر ادا کیا جائے"۔

مندرجہ ذیل حدیث میں صدقۃ الفطر کی علت مشروعیت سے بحث کی گئی ہے۔

فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روزوں کی تمام کوتاہیوں
زکوۃ الفطر طہرۃ للصیام من اللغو کو پورا کرنے کے لئے صدقۃ الفطر واجب کیا ہے، جس
والرفث وطعمۃ للمساکین شخص نے نماز سے قبل صدقۃ الفطر ادا کر دیا تو وہ
من اداھا قبل الصلوۃ فھی عظیم الشان صدقہ ہوگا جس کے قبول ہونے کی
زکوۃ مقبولۃ ومن اداھا بعد قوی توقع ہے اور اگر صدقۃ الفطر نماز کے بعد ادا
الزکوۃ فھی صدقۃ من الصدقات کیا گیا تو وہ منجملہ دیگر صدقات کے ایک صدقہ ہوگا
(ابوداؤد۔ ابن ماجہ)۔ جس کے لئے کوئی خاص درجہ نہیں ہے۔ (ملخصاً)

متذکرہ صدر حدیث سے "صدقۃ الفطر" کی وہ غایت معلوم ہو جاتی ہے جس کی بنا پر شریعت میں اس کی اتنی تاکید کی گئی ہے، فقہا اور محدثین نے متفقہ طور پر عجلت کی یہ علت بتلائی ہے کہ اس میں غربا کے لئے بہت کچھ سہولتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انھیں افلاس سے کسی نہ کسی حد تک سکون مل جاتا ہے اور وہ نماز بھی استغنار سے ادا کر سکتے ہیں چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہر دو علت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

وتودی صدقۃ الفطر اغناء صدقۃ الفطر قبل نماز ادا کیا جائے تاکہ فقیر
للفقیر لیتفرغ قلبہ للصلوۃ۔ مطمئن ہو جائے اور نماز کے لئے قلب میں یکسوئی
(ہدایہ باب العیدین)۔ پیدا ہو سکے۔

انہی احادیث کا اثر تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ عید سے ایک دو روز پہلے ہی صدقۃ الفطر ادا کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔

اسلامی نظام مالیات کے یہ چند شعبے ہیں جن کی اس قدر تفصیل کر دی گئی ہے جتنی کہ کسی مجلہ کے لئے قابل گنجائش ہو سکتی ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے مستقل تصانیف کا مطالعہ ناگزیر ہے جو اس موضوع پر اب تک لکھی جا چکی ہیں۔

اسلام کے پورے نظام مالیات کے محور کا اصول یہ ہے کہ دولت کسی ایک جگہ سمٹنے نہ پائے بلکہ وہ عام افراد کے درمیان منتشر اور منقسم رہے البتہ وہ شخصی املاک کے استحقاق کو تسلیم کرتا ہے اور جو دولت جائز ذرائع و وسائل سے حاصل کی جائے اور جس میں دوسروں کے حقوق کو پامال نہ کیا گیا ہو اسلام میں بلاشبہ ایسا شخص دولت کا جائز مالک متصور ہوگا اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کی دولت پر دست اندازی کا مرتکب ہو، یہ تو اسلام میں دولت کا اثباتی پہلو ہے اب اس کے منفی پہلو کو لیجئے جمع شدہ سرمایہ پر خواہ وہ نقد کی صورت میں ہو یا اموال تجارت ہو جس میں اشیاء خورد و نوش و استعمال سے لیکر جانوروں تک کی تجارت شامل ہے سالانہ ڈھائی روپیہ سینکڑہ کے حساب سے زکوٰۃ کے طور پر سوسائٹی کے حوالہ کرنا ناگزیر ہے، یہ شرح کم از کم ہے، جانوروں کا نصاب زکوٰۃ اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ اسلامی تقریبات عیدین وغیرہ کے موقعہ پر معمولی سرمایہ داروں کے لئے بھی ناگزیر ہے کہ وہ سوسائٹی کے لئے اپنی دولت کا کچھ حصہ مخصوص کر دیں تاکہ غربا بھی سوسائٹی کی مسرتوں میں شریک ہو سکیں، صرف یہی نہیں بلکہ ہر انسانی ضرورت اور رفاہ عامہ کے موقع پر سوسائٹی کی مرکزی قوت (حکومت) حسب ضرورت دولت کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

سرمایہ دار کی موت واقع ہونے پر اس کی منقولہ و غیر منقولہ املاک و جائداد اور سرمایہ کا کوئی شخص دوسروں کے حقوق کو پامال کر کے تنہا مالک نہیں ہو سکتا، نہ اسلام میں متوفی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دوسرے ممالک و اقوام کی طرح اپنے سرمایہ کی کسی خاص شخص کے حق میں وصیت کر کے اس کو منتقل ہونے سے روک دے بلکہ اسلام میں اس کے برخلاف متوفی کی املاک کو وراثت کے

ذریعہ سے متعدد حصوں میں علی قدر استحقاق منقسم کر دیا جاتا ہے۔ بیان کردہ امور میں یہ تین شعبے تو ایسے ہیں جن میں سوسائٹی کو بجبر انفاقِ مال پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور کسی ایسے شخص کو جو اسلام کے قانون کو تسلیم کر لیتا ہے اس سے مفر کی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے۔ البتہ وقف کے مسئلہ میں اختیاری اوقاف کا تصور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہے۔ اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ اس شعبہ میں مسلمانوں سے بڑھ کر کسی قوم نے فیاضی کا ثبوت نہیں دیا، دوسری اقوام میں اوقاف کی جو مثالیں نظر آتی ہیں وہ سب اسلام ہی کے خوانِ کرم کی خوشہ چینی ہے۔ صدہا سال تک مسلمانوں کے علمی اور رفاہِ عامہ کے بیشتر اجتماعی ادارے اوقاف ہی کے ذریعہ سے چلتے رہے ہیں۔ مساجد کے انتظامات، مدارس کے اخراجات، طلبہ کے وظائف، اساتذہ کے مشاہرے خانقاہوں کا تکفل، مہمان خانوں کی مسافر نوازی، شفاخانوں کی خدمات، محتاج خانوں کا قیام اور اسی طرح کے دوسرے رفاہِ عامہ کے اداروں نے بالعموم اوقاف ہی کے ذریعہ سے اپنی اپنی متعلقہ خدمات انجام دی ہیں۔ نفع عوام کا یہ شعبہ گو کچھ عرصہ سے کمزور ہوتا جا رہا ہے تاہم اس گئی گذری حالت میں بھی نفع عام کے بے شمار فوائد اس کے دامن سے وابستہ ہیں۔

اب وظائف اور غنائم کو لیجئے چونکہ وظائف کا رواج تقریباً ہر ملک میں ہو گیا ہے اس لئے اس کے فوائد و منافع کا اظہار کچھ زیادہ ضروری نہیں ہے، البتہ استحقاقِ وظائف میں اسلام دوسرے لوگوں سے بنیادی اختلاف رکھتا ہے اس کے نزدیک وظائف کے مستحق صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کی خدمات نفع عامہ کے لئے وقف (اصطلاحی معنی مراد نہیں ہیں) ہو کر رہ گئی ہوں۔ اسلام وظائف کو تعیش کا ذریعہ بنانا پسند نہیں کرتا۔

اہل فوج کے حقِ غنیمت کو موجودہ حکومتیں سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتیں، چنانچہ دشمن فوج سے حاصل کئے ہوئے اموال و ذخائر خالص حکومتوں کا جائز حق تصور کئے جاتے ہیں اور جو شخص سر سے کفن باندھ کر اس کو حاصل کرتا ہے وہ اس سے اتنا ہی بیگانہ رہتا ہے جتنی خود دشمن فوج! یہاں شاید یہ سوال پیدا ہو کہ اس زمانہ میں دشمن کے جن اموال پر قبضہ حاصل ہوتا ہے وہ حجم اور

جسامت کے اعتبار سے ناقابلِ تقسیم ہوتے ہیں لیکن اس کی مثالیں اسلام میں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں مگر کیا غنائم کا حجم وجسامت مسلمانوں کے جذبۂ تقسیم دولت کی راہ میں حائل ہو سکا؟ اسٹیٹ نے اپنا ۱/۵ حصہ نکال کر بقیہ ۴/۵ انہی لوگوں پر تقسیم کر دیا جن کے ذریعہ سے اس دولت پر قبضہ حاصل ہوا تھا۔ غرضکہ آپ اسلام کے نظامِ مالیات میں ہر جگہ یہ چیز بطور بنیادی اصول کے کارفرما پائیں گے کہ دولت کسی ایک جگہ سمٹنے نہ پائے، خواہ وہ حکومت کا خزانہ ہی کیوں نہ ہو بلکہ اس کو عام افراد کے مابین گردش کرتے رہنا چاہیئے تاکہ ہر شخص دولت سے بقدر استعداد تمتع کرتا رہے۔ چنانچہ مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاصؓ فرمایا کرتے تھے کہ اسلام نے ایک دولتمند کے ذمہ اتنے حقوق لگا دیئے ہیں کہ اگر وہ ان کو دیانت داری سے ادا کرے تو کبھی اس کی دولت ضرورت سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی۔

نوٹ: ۔اس مضمون کا ماخذ مندرجہ ذیل کتب ہیں:۔

قرآن مجید، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ، حجۃ اللہ البالغہ، احیاء العلوم
تاریخ یعقوبی، فتوح البلدان۔